کُندن

کندن مرگیا اور گھنٹے بجتے رہے !

کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا۔ معلوم نہیں کب سے، کم و بیش ۲۵۔۳۰ سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہوگیا تھا کہ وہ مرجائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا! طالب علمی کا زمانہ ختم کرکے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا، اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدت ملازمت ختم کی یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا۔ گھنٹے کی آواز روزمرہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہوگئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا!

کئی دن بعد کسی۔۔۔ نے بتایا، کندن مرگیا۔ ایک دھچکا سا لگا، ارے کندن مرگیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسب معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہوگیا کہ کندن مرگیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا! پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ سے ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں، نظام فطرت

Scanned by CamScanner

میں اس سے زیادہ ناقابل التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بے زاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظام فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی "تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی!"

کندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک، کی کلاسیں باہر آجاتیں۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون یا سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف امیر غریب گھرانوں کے خوب رو خوش اطوار ہنستے بولتے نوجوان اسی طرح برآمد ہوتے جیسے بقول انشا "ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانان چمن" ایک سرے سے دوسرے سرے تک، کتنے خاندانوں کی امیدوں اور امنگوں کا چمن کھلا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہماہمی رہتی پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھے مقررہ وقفے کے بعد کندن گھنٹہ بجاتا، وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آجاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا کندن کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لئے نہیں جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لئے۔ ہمیشہ جواب دیتا، حضور فلاں گھنٹہ، چل رہا ہے

پوچھنے والا طالب علم ہو، معلم ہو یا کلرک۔ اس کے بجو رکھنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشنامد یا تنسیدر کی گراوٹ نہیں۔

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں کر دیا کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس ۳۰۔ ۳۵ سال میں ہم سے قریب، ہم سے دور ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے، نوجوانوں کی کتنی نسلیں اور اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے معارلوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا نہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹو لہ۔ یہ سب ہوتا رہا۔ لیکن کا کندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود و معتبر ہونے کا اعلان تھا لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہنا ہے۔ کندن مر گیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ نہ زندہ بچو نوئی یا نسق بچو مٹی! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی!

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا۔ کندن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹننٹ اور رکو اڈ ینگل (دیکھی پکی بارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی

کمانڈر مقرر کیا اور کھیپرا ایک بڑھا مہتر کو لانس کا پورل Lances corps یا
Mirza Akhtar Husain's
Fussilies's (مرزا اختر حسین اون فوسیلیری) کے
لقب سے اور عوام میں لندن کا سفر بینا کے نام سے مشہور رہوئی، امتحان کے
زمانے میں شروع سے آخر تک یونیورسٹی میں مرزا صاحب لندن اور یہ سفر
بینا بلڈنگ ایک دوسرے سے جدا یا دور نہیں دیکھی گئی!

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے
اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے۔ جن کے لئے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال
تھا لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے جیسے نہ صرف امیدوار
بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے شریک ہو جانے کا امکان تھا
اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزرتے تو اس کے اونچے برآمدے
کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے کرتے کوٹ کی اوپر کی جیب
میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا
کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو لبوں میں دبا،
رکھتے تھے ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے بغل میں طرح طرح کی فائلیں،
اور کاغذ کے پلندے ڈیسک یا کرسی پر یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت
دیکھی کھریا سے نشان لگا دیئے یا پنسل سے نوٹ لکھ دیے۔ زینے پر لندن

Scanned by CamScanner

اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی سفر مینا "جاروب بدست وکھرپا در بغل اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسا آج کل قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے لئے کوئی بیتا کھڑا ہو اور دوسرے حسب مراتب نیچے صف آرا ہوں مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کندن ؛ سفر مینا کے ایک حصے کو ساتھ لے کر اسٹڈی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہو جاتا دوسرا ڈیٹچ منٹ اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے یا گھاس کھودنے لگتا!

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا، یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور پر کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں لیمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے اس کا حساب کندن رکھتا تھا اور مرزا صاحب ان اخراجات کا بل امتحانی فنڈ سے ادا کرتے تھے۔ ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کندن پر گرج رہے ہیں، قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی۔ مرزا صاحب کندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع کی، اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا" مرزا صاحب کے حضور میں کندن کسی

Scanned by CamScanner

قدر شوخ تھا۔ کہنے لگا حضور اطلاع کرنا تو پہلے صاحب کے گھر والوں کو کرنا آپ کو کرنے سے کیا فائدہ ہوتا! مرزا صاحب نے فوراً اس درخواست پر بھی سرخ پنسل سے نشان لگا کر پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لئے یہ رعایت ہمیشہ کے لئے اٹھا لی! چوزا فوسے بکیے بے دانشی کرو!

مرزا صاحب نے اندرونی ملازموں کے لئے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ ہر سال امتحان کی پرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیاں بنائی جاتی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے حضور خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے، ان کا موصوف نے منصب یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا۔ جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابان اودھ کے ہاں وثیقے دار ہوتے تھے۔ اسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے، یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دیے جاتے تھے۔ بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوس شاہی کا یوم تقریب، دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی عظمت الٰہی صاحب زبیری کے عہد حکمرانی تک برقرار رہی اس کے بعد یہ قصہ جھگڑا گیا۔ کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ

وہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہنچا دیتا اور ہم سب کی توقع کے مطابق انعام پاتا۔ کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو پوچھ لیتا کیوں کندن مرزا صاحب کے یہاں ہماری کارگذاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ تول ٹھیک ہے؟ کہتا حضور بالکل ٹھیک ہے کہا خاطر جمع رکھیں ۔

ایک دن کندن کی عملداری میں سے گذرا۔ نئی کاپیوں کے لئے پرانی کاپیاں پھاڑی جا رہی تھیں۔ پوچھا کندن ہمارے وثیقہ کا کیا ہوا، بولا حضور اب نابی (نوابی) نہیں رہی، دوسری عملداری ہے! میں نے کہا کوئی بات نہیں تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لئے نوابی زمانے والوں کے پاس آ ہی جایا کرو!

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہو کر پٹنہ چلے گئے اور امتحانات کے لئے جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصے میں آ گیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کئے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزم میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے

Scanned by CamScanner

بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو گویا انھیں کا ہو جاتا ہے لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف تقریبات خود کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے ان ہی میں سے ایک کندن تھا۔ تقریب کہیں ہو کیسی ہو، وقت کم ہو مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں۔ گذشتہ ۳۰۔ ۴۰ سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے!

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں "صلائے عام" کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کی یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا برا اس بحث سے قطع نظر واقعہ یہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی یا خرابی کا غالباً وہ تقاضہ بالتواتر نیم شعوری طور پر پورا کر لیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے! یونیورسٹی کے بڑے عہدہ داروں کی ایک اہم صفت اور ان کے ثبات صحت وحواس کا قوی ثبوت یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ہفتہ یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں خورد و نوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخرو رہے!

Scanned by CamScanner

کسی شعبے یا شعبے کے کسی کمرے میں کتنے ڈسک اور کرسیاں ہیں، کس حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ میں آگئیں، ان کے بدلے میں کتنی ... آئیں اس کی خبر جتنی کنڈن کو تھی، خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی قلت وقت کی تنگی، کمروں کی کمی ان سب سے نپٹنے کے لئے کنڈن کی "ایک شخصی وزارت" کا مشورہ اور مدد لازمی تھی کنڈن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہو سکتا ہے۔ امتحان ... قریب ہوتا تو ہر شعبہ کے ... کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آجاتا کہ امتحان کے لئے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈسک مہیا کئے جا سکیں، شکر گزاری کے موجب ہوں گے یہ خط لے کر کنڈن جاتا۔ پوچھتا۔ کنڈن کیسے آنکلے؟ مجبوراً امتحان نہ ہے، کرسی ڈسک چاہئیں، بھئی یہ ہمیشہ کا دھندہ ہے۔ اس میں ایسا پوچھنا کیا میاں خان (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کنڈن سامان اٹھوا لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر ہر کرسی اور ڈسک اسی کمرے میں اسی قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبہ کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے۔ اس سے پہلے ان پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا۔ لیکن کنڈن کی پہچان اور انکل کو کیا کہیے کہ ہزار دو ہزار کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے کس خاندان

کی ہیں ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبہ جات جن کی امانت اور نگہداشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی یاترا یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہو گیا یا کسی کو اغوا کر لیا گیا!

کنووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہو کر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً اتنے ہی اشخاص کے لیے بعد عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے جس طریقے سے جیسی گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے، چائے کے لئے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چائے کے لیے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے انتظام تین گھنٹے کے اندر اندر اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صبح کی ترتیب کو یکلخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے، سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائے گا، جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازی گر کھلا! رات گئے تک یہ ہنگامۂ شعر و سخن، برپا رہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز اور کرسیاں حسب معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے!

Scanned by CamScanner

جلالتہ الملک شاہ سعود اور اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران سے کے مختلف اوقات میں ورود کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں کیا گیا تھا۔ جس میں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالیشان عمارت کھڑی ہے۔ یہیں ان کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کرکٹ دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا۔ دونوں تقریبوں میں حسب معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فصل تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصہ میں منتقل کر کے پلان کے مطابق ترتیب دینا کمنڈن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیاء کو حسب منشا میزوں پر چن دینا دوسرے کمنڈنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسب معمول اس خوش اسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے، اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دستگاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے ان کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا موکل قبضے میں ہوں۔

Scanned by CamScanner

یونیورسٹی میں بھی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں، نشستوں کے لیے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پہ بھی جلدی اور حسن خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح و سالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی۔ نہ چیخ پکار نہ دوڑ دھوپ نہ تو تکار۔ کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہوتا جا رہا ہے جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھی کام کرنے والوں کا جتنا لگاؤ تھا وہ ان کندن کو نصیب تھا کم، دیکھنے میں آیا۔ کبھی بعض ممبران اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں نزاکتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا۔ اس کا کسی شعبہ میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیے۔ اس کے کہنے کو کوئی نہیں ٹالتا تھا حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی۔ لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا۔ اس کی کون نہ مانتا!

میرا خیال ہے کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا ہو لیکن اس کی اٹکل اور قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ

مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں، کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جا سکتی تا وقتیکہ اس پر کامل بھروسہ نہ ہو۔ کنڈن کی ایمانداری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلّم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر کی کاپیں دوسرے سرکاری نیم سرکاری اور پرائیویٹ کام بے تکلف سپرد کر دیئے جاتے تھے۔ کنڈن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار نئی سرکاری بائیسکل پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا کنڈن نے آ کر بتایا کہ سائیکل کو اٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع تو اختیاطاً پولیس کو کر دی گئی لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کنڈن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری گئی۔ اور بس۔

امتحان کی کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پٹنے پر باہر بھیجا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ ممتحن کو وہ پارسل نہیں ملا۔ وہاں کے ریلوے دفتر سے پوچھا گیا تو جواب آیا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا، جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کنڈن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جا کر اسٹیشن پر ادھر ادھر

Scanned by CamScanner

دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے یہی انکار کیا کبھی ٹالنا چاہا، بالآخر کندن نے وہ تیور دکھائے۔ اختیار کیا جو کبھی کبھی بہ درجۂ مجبوری ہم کو اپنی سفرمینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرنا تھا۔ اور کہا کہ پارسل گھر میں لے چلو میں خود تلاش کر لوں گا۔ یہ آخر یہ چیلنج ان کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جاکر پارسلوں کے جنگل میں اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا، امتحان ہی کی طرح طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے اور پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے نیلے اور پیلے گڈمڈ رکھے ہوں گے، ان میں سے کندن کا اپنا پارسل کو دریافت کر لینا کتنے اچنبھے کی بات ہے۔

۱۹۴۷ء کی قیامت برپا تھی علی گڑھ کے نواح میں قتل و غارت گری کی جیسی ہولناک خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوسی اور درماندگی کا جو عالم طاری تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس زمانے میں یہاں تھے۔ کندن کا مکان دودھ پور میں تھا جو یونیورسٹی سے ملا ہوا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی ہے یونیورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کندن سے دوچار ہونے کا اتفاق ہوتا تھا پوچھتا کہو کندن کب تک یہ خون خرابہ رہے گا، گاؤں میں کیا خبر ہے، کندن سر جھکا

لیفٹیننٹ جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو۔ کہنا ہے کہ ضرور کالج پر سید صاحبؒ کی دعا ہے، سب خیریت رہے گی، کالج کا بڑا نمک کھایا ہے، یہ علیسر لاز لے رکھ لے! اس زمانے میں میں نے کندن سے زیادہ مضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا، جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو "سید صاحبؒ" کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہو!

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے دہلی کے ایک ایسے محلے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آ رہے تھے نہ کوئی جا سکتا تھا نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے۔ وہ بیان سے باہر ہے اس واقعے کا علم کندن کو ہوا تو اس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کر دیں، صورت حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا، لیکن اس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کیا اور بے محابا دلی کی آگ میں کود پڑا سب کو نکالا اور بہ حفاظت علی گڑھ لا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقلمندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا اس کا ذکر اس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا، وہ بتاتے تھے کہ کندن پر کب کیا گزری۔ کندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی

طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جسکو کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ نو خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی، بات کرکے بھی بڑے بنے رہتے ہیں جبکہ چھوٹا آدمی بڑے کام کرکے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہیے یا لکھ کر کوئی کیا کرے گا!

عرصے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں یہ صدا سنادی کہ فلاں دن نے کندن کو دودھ پور کا راج پرمکھ قرار دیدیا پوچھا، کیوں کندن چپکے چپکے راج پرمکھ بن گئے خبر نہ کی۔ بولا حضور یہ لڑکے ہیں جب چاہیں خود راج پرمکھ بن جائیں۔ جب چاہیں دوسرے کو بنا دیں۔ ان کا کیا؟

اسٹریچی حال کے دائیں بائیں زینے دار دور لستے ہیں جن کے سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں جن سے سید محمود اور سر سید کورٹ میں آمدورفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھری ہے۔ ان میں سے ایک کندن کے قبضے تھی۔ معلوم نہیں کب سے یونیورسٹی کھلی ہو۔ ادھر سے گزرے تو کندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو، یا آفسوں کا کوئی عہدہ دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا مزاج پوچھتا کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو بجا لاؤں۔ جب تک دروازے سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ نکتہ رس کم کے خیال سے بھی اور شاید ذمہ داری

کے اس تفاوت کی بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس
کی عملداری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں!

مگر سسٹر کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ
کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کندن کی،
عمر ایک خاص حد پر آکر ٹھہر سی گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قوئی شکل و صورت
اور رفتار و گفتار میں عرصے سے، نمایاں محسوس نہیں ہوئی ممکن ہے جیسے
روز دیکھنے اور عزیز رکھتے ہوں وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو!

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی مگر نہ مضبوط جسم، گھنٹے
ہی کی طرح بجتی ہوئی پاٹ دار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ کس بلا کا مستعد
اور محنتی یہ شخص تھا نہ دن دیکھنا نہ رات، نہ سردی نہ گرمی نہ بارش، کبھی کوئی
کہتا، کندن بوڑھا ہوا اتنی محنت نہ کیا کر تو وہی کلمہ دہرا دیتا جو اسکا تکیہ کلام سا
بن گیا تھا یعنی "حضور کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے"!

یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ، کبھی پاجامہ
کبھی دھوتی پہنے اپنی عملداری میں، وکٹوریہ گیٹ سے لے کر باب اسحٰق تک
گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم
ہوتی ہو گی جنھوں نے ۳۰۔۳۵ سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے،
اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا ہو گا۔ اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی

Scanned by CamScanner

کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے!

ایک دن میں نے کہا کندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونیفارم کھوڑے کوٹ) میں خاص طور سے جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نیپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نیپولین کو جانتے ہو کون تھا۔ بولا میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا ہسٹری ڈپارٹمنٹ تمہارے سامنے ہیں لبا ہو اہے کسی دن وہاں پوچھ آنا۔ ایک زمانے میں کالے کوسوں دور ولایت میں تمہاری ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس کے طالب علموں کی طرح وہاں کے لوگ اور وہاں کی راجدھانیاں الٹ پلٹ ہوتی رہتیں۔

آخر زمانے میں کندن نے اپنے لیے ایک تنہا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ "کالج کا نمک کھانے کا" ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا، تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے۔ ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے کرانے یا دیکھنے کو جی چاہتا ہے یا اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس حرکت سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا!

کندن کی نظر اور نگرانی میں سرسید کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔

Scanned by CamScanner

اسٹڈیکی ہال کا وہ ننھا تمام عمر کلبلہ بجا دہ رہا، یہ مضبوط شاندار تنا رہتی عمارتیں اس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں، زندگی بھر وہ انہی عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تفریحوں کی بساط وہی بچھاتا۔ ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے طرز عمل پر کیسا پڑا ہوگا۔ "کالج کا نمک کھانے" کا ایک اور اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک۔ جو کندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں۔ کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا!

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے روز بروز تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکر میں کندن ادھوا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کمی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے نا قابل تسخیر کندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کندن کو بچایا جا سکتا تھا!

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات امڈے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفاشعاری اور فرض شناسی

سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پہ بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں ان کو روکا جا سکتا ہے یا ان کی روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج یا کل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو کندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں بالخصوص نووارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے، وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک شخص تھا۔ یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس صورت حال پہ ماتم کرنا نواب کا کام نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب تک ہم "گذشتہ سے پیوستہ" ہیں گذشتہ کا ذکر خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو اب تک بدلی ہے نہ کبھی بدلے گی!

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی پرانی ہو جاتی ہے، یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پرانی دنیا کی یہ بات قابل فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ اس پر یہاں کون بحث کرے۔ "قابل لحاظ اور قابل فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی!

Scanned by CamScanner